عورت کی محبت اور نفرت

علشباء تل منتها

قلمی تعارف

میرا نام علشباء تلِ منتہا ہے۔اور لفظوں کی دنیا میرا اصل مسکن ہے۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ زندگی صرف جینے کا نام نہیں، بلکہ اسے محسوس کرنے، پرکھنے اور پھر قرطاس پر بکھیرنے کا فن ہی اصل تخلیق ہے۔ ناول نگاری میرے لیے محض کہانیاں سنانا نہیں، بلکہ کرداروں میں سانس ڈالنا، ان کے دکھ سکھ کو جینا، اور قاری کو ان کے ساتھ ہنسنے اور رونے کا موقع دینا ہے۔

میں ایک حساس دل، سوال اٹھاتی سوچ اور خاموشیوں کو آواز دینے والے قلم کی وارث ہوں۔ میرا پہلا ناول "عورت کی محبت اور نفرت" عورت کے ان جذبوں کی ترجمانی ہے جو صدیوں سے دبائے جا رہے ہیں — کبھی محبت کے لبادے میں، کبھی نفرت کے طوق میں۔

میری تحریر ظلم کے خلاف اعلانِ حق ہے۔ میں لکھتی ہوں کہ عورت کمزور نہیں، بس خاموش ہے۔ اور جب وہ بولتی ہے تو یا تو محبت کرتی ہے، یا نفرت — درمیان کچھ نہیں چھوڑتی۔

عورت کی محبت اور نفرت" میرے ادبی سفر کی ابتدا ہے، لیکن" میرے قلم کی منزل ایک سوچ کا انقلاب ہے۔ میں لفظوں سے چیخیں بلند کرتی ہوں، جذبوں کو چہرہ دیتی ہوں، اور عورت کو اس کی اصل پہچان واپس لوٹاتی ہوں۔

قلم میرا ہتھیار ہے، اور سچائی میری ذمہ داری۔

یہی میرا تعارف ہے، یہی میری پہچان۔

علشباء تل منتہا

---------- -------------

عورت کی محبت اور نفرت
از قلم علشباء تل منتہا

"کہتے ہیں عورت صرف محبت کرنا جانتی ہے، مگر وہ نہیں جانتے کہ جس دل میں محبت جنم لیتی ہے، وہی دل نفرت کو بھی پالتا ہے۔"

باب نمبر: ۱
عکسِ گمنام

کابل کی فضا میں اداسی گھلی تھی۔ جنگوں سے تھکے ہوئے شہر میں بھی کچھ آنکھیں خواب دیکھتی تھیں۔ انہی خوابوں میں ایک خواب صارم کا بھی تھا—محبت کا، مکمل ہونے کا۔

وہ سمجھتی تھا، اس نے جس شخص سے محبت کی، وہ اس کی تقدیر ہے۔ لیکن تقدیر کب کسی کی ہوئی ہے؟

آج، برسوں بعد، اسی افغانستان میں، ایک ٹوٹی ہوئی لائبریری کی خستہ دیوار پر خون سے لکھی ایک تحریر نے اُسے جھنجھوڑ دیا:

"محبت مت کرنا، صارم... کیونکہ جس نام کو تم پوجتے ہو، وہی تمہارے عذاب کا آغاز ہے۔"

اس تحریر کے نیچے وہ نام لکھا تھا—
وہی نام، جس نے اسے محبت دی... اور موت بھی۔

کابل کی سرد شام میں جب پہاڑوں پر دھند چپکے سے اتر رہی تھی، ایک سیاہ جیپ افغان انٹیلیجنس ہیڈکوارٹر کے عقب میں رکی۔ دروازہ کھلا، اور وہ اترا—لباس سادہ، چہرہ سخت، آنکھیں وہی تھیں... جن میں برسوں سے صرف ایک عکس ٹھہرا ہوا تھا۔

اُس نے جیب سے پرانی، کچھ مڑی ہوئی تصویر نکالی۔ تصویر میں ایک باپردہ لڑکی تھی، جس کے ہاتھ میں قرآن تھا اور آنکھوں میں شکوہ۔ وہ اُس کی زندگی کی سب سے خاموش تڑپ تھی۔ چار سال سے اس نے صرف پردوں کے پیچھے، لفظوں کے بغیر اُس سے محبت کی تھی۔

بینش شاہ میر ..." اُس نے زیرِ لب اُس کا نام لیا، جیسے کوئی " اذان کے بعد دعا مانگتا ہو۔

ایک لمحے کے لیے اُسے یوں لگا جیسے کابل کی گلیوں میں بھی اُس کی مہک بسی ہوئی ہو۔ جیسے لاہور سے اُڑی وہ خوشبو، پہاڑوں کی بلندی پر بھی آ پہنچی ہو۔

"مشینیں بدلتی رہیں، مشن بدلتے رہے... پر یہ دل صرف ایک چہرے پر رکا رہا۔"

ہیڈکوارٹر میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، جیسے کوئی دعا کے قبول ہونے کی امید میں آنکھیں اٹھاتا ہے۔

لاہور، شب کا تیسرا پہر

بینش کی آنکھ ایک عجیب سی بےچینی سے کھلی۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی، صرف گھڑی کی ٹِک ٹِک اُس کی بےقراری میں اضافہ کر رہی تھی۔

وضو کیا، جائے نماز بچھائی، اور سجدے میں سر رکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سجدے میں اُس کا دل کسی انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ جیسے کوئی دور، بہت دور... اُسے پکار رہا ہو۔

نماز کے بعد، اُس نے ہاتھ اٹھائے:

"یا رب، اگر وہ کہیں ہے، تو اُس کی حفاظت فرما... اور اگر وہ خواب ہے، تو میرے دل سے نکال دے..."

نماز کے بعد وہ کھڑکی کے پاس آئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اُس کے چہرے سے ٹکرایا، اور اُسے لگا جیسے کسی نے سرگوشی کی ہو:

"کبھی خوابوں میں کابل دیکھا ہے تم نے، بینش؟"

اُس نے چونک کر پلٹ کر دیکھا، مگر کمرے میں کوئی نہ تھا۔

اسی لمحے اُس کے فون پر ایک میسج آیا—نمبر اجنبی، لیکن الفاظ شناسا:

"پہاڑوں میں وہی خوشبو ہے، جو لاہور کے پردوں میں بسی تھی... تم دعاؤں میں ہو۔"

"پہاڑوں میں وہی خوشبو ہے، جو لاہور کے پردوں میں بسی
"تھی... تم دعاؤں میں ہو۔

بینش کے دل کی دھڑکن رک سی گئی۔

جائے نماز پر بیٹھی تہجد کی پر اسرار خامشی میں گڑگڑاتے ہوئے وہ ایک شخص کو مانگ رہی تھی جو اس کے وجود کو اپنے نام کے ساتھ تقدیر میں لاکھوئے ہوئے تھا۔۔
مگر تقدیریں کہاں اک جیسی رہتی ہے جب دعاؤوں میں تاثیر ہوں --
اتنی دیر میں فون کی گھنٹی بجتی ہے۔۔ بینش اپنے آنسو پونچھتے ہوئے جائے نماز سے اٹھتی ہے۔ اتنے میں اس کے والد جن سے اس بہت انسیت تھی وہ تہجدسے فارغ ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہے۔ فون اٹھا کر سلام کرنے کے بعد
انا للہ و انا الیہ راجعون
پڑھتے ہیں۔ بینش خاموش نظروں سے ڈوپٹہ سر پر لپیٹے انھیں تک رہی تھی۔ وہ اس کی والدہ کو بتاتے ہے کہ ان کا بھانجا کابل میں آپریشن کے درمیان مارا گیا ہے۔ شہید کا اللہ کے ہاں بہت مرتبہ ہے۔
صارم ہمیشہ زندہ رے گا"۔"
ایک لمحہ — ایک سانس — اور بینش کی دنیا میں خاموشی کا جنازہ اٹھا۔

تسبیح کا دھاگہ ٹوٹا، دانے فرش پر بکھر گئے۔

تسبیح کا دھاگہ ٹوٹا، دانے فرش پر بکھر گئے۔

اور دل...
دل کسی پردے کے پیچھے بیٹھا، ماتم کرنے لگا۔

بینش کے سر پر آتش فشاں کہکشاں کی صورت میں پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کانوں میں ازانوں کی گونج کے بجائے۔ "صارم ہمیشہ زندہ رہے گا" کی گونج بڑھتی چلے گئی۔ ایک ایسا شخص جسے کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ محض اک رشتہ قائم تھا۔ اس کا نام بھی اس کی موت پر معلوم ہوا تھا۔ وہ بے حس و حرکت دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ یکدم گرتے پڑتے کمرے کو بھاگی۔

کراچی کی اس قدیم پیر حویلی میں آج غیر معمولی خاموشی تھی۔ در و دیوار پر ایک بے نام بوجھ اٹکا ہوا تھا۔ جیسے وقت رک سا گیا ہو، یا جیسے کسی نے زندگی سے رنگ چھین لیا ہوں۔ صارم کی موت پہ آہ و زاری ہو رہی تھی۔

شاہ میر شاہ کے بنگلے میں صبح کا وقت تھا ۔ باغ کے درختوں کے پتوں سے چھن کر آتی دھوپ میں بھی ایک طرح کی بے چینی تھی۔۔

جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کی جارہی ۔

بینش پیر حویلی جانا ہے ہمیں آج جنازے کیلئے

آنکھیں مت چڑائے امّاجان

اتنی خشک کیوں ہوں بیٹا

خشک نہیں خود پسند ہوں۔

فرق نہیں پڑتا۔

اپنا درد انسانوں کو سنانے کی بجائے رب کو سناؤ تو رسوائیاں نہیں ملتی۔۔۔

کیسی ہو بینش۔

اچھی ہوں۔

تمھیں کیا ہوا ہے

کیا کچھ ہونا تھا

ارے ہاں! میں تو بھول ہی گئ ۔ والدہ حضور نے جنازے کی بابت کے متعلق بھیجا تھا۔ بیچاری زلیخا پھو پھو! اکلوتے بیٹے کا غم کیسے برداشت کریں گی۔

شاہ نواز شاہ کے دو بیٹے اور اک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا شاہ میر شاہ جنھوں نے خاندان کے باہر شادی کی ان کی بیوی صالحہ بیگم ان کی ایک ہی بیٹی ہے بینش شاہ میر جو پیرنی ہونے کے ساتھ ساتھ پردہ دار اور نہایت باوقار لڑکی ہے۔

ان کا دوسرا بیٹا شاہزین شاہ جن کی شادی خاندان میں ہی زبیدہ بیگم سے ہوئی اور ان کی بھی ایک ہی بیٹی سارہ ہے۔

ان کی بیٹی زلیخا بیگم جن کی شادی بھی خاندان میں ہوئ

ان کا دوسرا بیٹا شاہزین شاہ جن کی شادی خاندان میں ہی زبیدہ بیگم سے ہوئی اور ان کی بھی ایک ہی بیٹی سارہ ہے۔
ان کی بیٹی زلیخا بیگم جن کی شادی بھی خاندان میں ہوئ تھی۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا صارم سکندر جو آرمی آفیسر ہے۔
چونکہ شاہ میر شاہ جو گدی کے حقیقی وارث ہے مگر انہوں نے صالحہ بیگم کے ساتھ وفاداری نبھائیں اور اپنی گدی چھوڑ دی۔ اور لاہور آکر رہائشی پزیر ہو گۓ۔ ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا۔ تو زبیدہ بیگم نے بھی ان کے ساتھ ہی جانے میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ شاہ میر شاہ کے گدی چھوڑنے میں شاہ بدر کا ہاتھ تھا۔ جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ اور گدی کا حصول چاہتے تھے۔ ان کی شادی حاکم بی سے ہوئی۔ان کا ایک بیٹا ہے۔ شاہ مراد جو عیاش طبیعت کا مالک ہے۔ ہر برے کام میں ملوث ہے۔ اور شاہ بدر گدی پر براجمان ہے۔
مگراب گدی کی حقیقی وارث بینش میر شاہ ہے۔
شاہ نواز شاہ نے بچپن میں لاہور آنے سے پہلے بینش کو صارم سکندر کی منگ قرار دے دیا تھا۔

رخسار کی والد خاندانی ملازم تھے۔ ان کی اور انکی بیوی کی موت کے بعد صالحہ بیگم نے اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی پالا تھا مگر وہ بینش کو اس کے مقام کے باعث پسند نہیں کر تی تھی۔

اسلام علیکم! چچی جان
وعلیکم السلام! کیسا ہے میرا چراغ؟
جی بہتر ہوں۔
بینش! میری جان ہم کچھ دیر تک نکلے گے حویلی کیلۓ۔
اسکی وہاں کیا ضرورت ہے۔ صالحہ بیگم کی تیوری چڑھی تھی رخسار کی بات پر۔ میرا مطلب ہے کہ شرعی پردہ کرتی ہے ناں۔

رخسار کی بات پر۔ میرا مطلب ہے کہ شرعی پردہ کرتی ہے ناں۔
کیا کچھ غلط کہا میں نے
نہیں بس غلط موقعے پر۔
بھابھی خون تو خون ہوتا ہے۔ اس کی خوشبواور بدبو سے اندازہ ہوتاہے پیداوار عمدہ ہے یہ ناقص۔ اب ہمارے خاندان کی وارث سے مقابلہ بازی ہو گی۔ االلہ عالم!

دن کے آخری پہر کی نرم دھوپ کمرے میں بکھری تھی۔ بینش کھڑکی سے جھانکتی ہوئی ایک پرانی کتاب میں کھوئی ہوئی تھی جب دروازہ دھپ سے کھلا۔ وہ چونکی، اور سامنے رخسار کھڑی تھی — جھاڑیوں جیسے بال، آنکھوں میں کسی ان دیکھی آگ کی چمک۔

"کیا بات ہے؟ دروازہ کھٹکھٹانا بھول گئیں تم؟" بینش نے نرمی سے پوچھا، جیسے ہمیشہ۔

رخسار کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، "دروازہ تو تم جیسے لوگ بند ہی رکھتے ہو، بیت۔ صرف اپنے جیسے لوگوں کے لیے کھولتے ہو۔"

بینش نے کتاب بند کی۔ "تمہارا مسئلہ کیا ہے، رخسار؟"

"مسئلہ؟" رخسار نے سرد مہری سے قہقہہ لگایا، "مسئلہ یہ ہے کہ تم سب کچھ پا کر بھی وہی بننا چاہتی ہو جو میں ہوں — آزاد، بے خوف۔ لیکن تم صرف نقاب ہو، اصل تم کچھ بھی نہیں۔"

بینش نے کچھ کہنا چاہا، مگر خاموش ہو گئی۔ اُس نے پہلی بار محسوس کیا کہ رخسار صرف نفرت نہیں کرتی، وہ حسد کے زہر

بینش نے کچھ کہنا چاہا، مگر خاموش ہو گئی۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ رخسار صرف نفرت نہیں کرتی، وہ حسد کے زہر میں ڈوب چکی ہے۔

بینش پھو پھو کتنے بڑے سانحے سے گزری ہے اب تک تو صبر آہی گیا ہوگا۔ ہمم یونیورسٹی کا پہلا دن ہے کل جلدی سو جانا اب چلو۔
سارہ کے نزدیک وہ بینش کی کل کائنات جانتی ہے مگر وہ غلط تھی اس کے دل اور تنہائی کو وہ کبھی پرکھ ہی نہ سکی۔
کوئی بینش سے پوچھے اپنوں کو کھونا کیسا ہوتا ہے۔
کوئی سارہ کو بتائے زخم کریدنا کیسا ہوتا ہے

صبح کی مدھم روشنی کمرے کی کھڑکیوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ ہلکی سی ٹھنڈی ہوا پردوں سے کھیل رہی تھی اور پرندوں کی چہچہاہٹ ایک روحانی سکون کا پیغام دے رہی تھی۔ بینش نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ وہ ہر روز کی طرح فجر کے وقت بیدار ہو چکی تھی، مگر آج دل خاص طور پر ہلکا اور مطمئن تھا۔

نماز کے بعد وہ کچھ دیر تسبیح پر مشغول رہی، پھر چپ چاپ اپنے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی، جہاں سے اسے دھوپ کی پہلی کرنیں بہت بھلی لگتی تھیں۔ لاہور کی صبح کچھ خاص ہی دلنواز تھی، جیسے شہر بھی اس کے ساتھ جاگ رہا ہو۔
آج ہوا میں عجب ہی فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خود بھی اس راحت سے بے خبر تھی۔ بہار کا موسم مدت کے بعد بھلا لگا تھا۔

ناشتہ ہلکا سا کیا۔ چچی اور ان کے بیٹے بھی دسترخوان پر آ

ناشتہ ہلکا سا کیا۔ چچی اور ان کی بیٹی بھی دسترخوان پر آ گئیں، چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئیں، ہنسی بھی بکھری، مگر بینش اندر سے خاموش ہی رہی۔ وہ زیادہ بولنے والی نہیں تھی، خاص طور پر جب دل میں کوئی ان دیکھے جذبے کے جکڑ چل رہے ہوں۔

بینش سیاہ تنہائی جیسے چمکدار عبایا پہنے روپوش تھی آنکھوں کے سوا ہر چیز ہر اعضاء جسم کا ہر حصہ سیاہ کپڑے سے بچا ہوا نہیں تھا۔ اور پھر سیاہ دوپٹہ سنوارا۔ کالے فریم کی عینک آنکھوں پر رکھتے ہوئے اس کی نظر خود پر آئینے میں پڑی —سنجیدہ، خاموش، اور کچھ کھوئی کھوئی سی۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار تھی۔
صالحہ بیگم اور شاہ میر شاہ نے اپنی صاحبزادی کا ماتھا چوما۔ گھر کے گیٹ سے نکلتے ہوئے وہ سیاہ پری محسوس ہوئ۔ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے دعا کی ہو کہ آج کا دن خیر و عافیت سے گزرے، اور شاید وہ چپکے سے کسی کی موجودگی بھی محسوس کر رہی تھی—کسی انجانے کی جو برسوں سے اس کے دل کے آس پاس تھا۔
وہ اور سارہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اس میں بیٹھی اور شہر کے شور میں شامل ہو گئی، مگر اس کا دل ،ابھی تک صبح کے اُس سکون میں گم تھا،

جہاں کچھ ان کہی دعائیں اوران دیکھی امیدیں بسی ہوئ تھی

یونیورسٹی کی راہداریوں میں اچانک گولیوں کی آواز گونجی، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ چیخ و پکار سے فضا لرز گئی۔ طلباء بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے، مگر وہ... وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ جیسے پاؤں زمین سے جکڑ گئے ہوں، جیسے ہوش و حواس نے ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

اور پھر...

ایک سایہ سا لپکا۔ کسی نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر جھٹکے سے زمین پر گرا لیا۔ گولیاں اس کے سر کے اوپر سے سنسناتی ہوئیں گزریں، مگر اب وہ محفوظ تھی۔

چشمہ اُس کے چہرے سے اُتر کر زمین پر جا گرا۔
جب اُس نے آنکھیں کھولیں، تو سامنے اُس کی نظریں اُس سے ٹکرائیں۔ وہی شخص، وہی راز۔ جو برسوں سے خاموشی سے اُس کے گرد موجود رہا تھا۔ اب بالکل قریب تھا۔

اور جب اُس نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا... وہ ٹھٹک گیا۔

وہ آنکھیں — جنہیں وہ صرف فاصلے سے جانتا تھا — اب بے نقاب تھیں۔ درد سے بھری، وقت کے تھپیڑوں سے نم زدہ، جیسے برسوں کا کرب اُن میں سمٹ آیا ہو۔
وہ اس کی آنکھوں کی نمی میں اس طرح کھویا جیسے گہرے سمندر میں غوطہ زن ہو رہا ہوں۔ ویسے ہی اس نے ان مشکوک

سمندر میں غوطہ زن ہو رہا ہوں۔ ویسے ہی اس نے ان مشکوک لوگوں کو فائر کر دیا۔

بینش نےخود کو اس سے الگ کرنے کی کوشش کی مگر وہ اور مضبوطی سے تھام گیا۔اس کی آنکھیں اس سے ملی اور ایسی ملی کہ پلٹنا بھول گئی۔ وہ وہی آنکھیں تھیں جو خواب میں اکثر اسے بےبسی کی تصویر لگتی تھی۔

اب تم محفوظ ہو..." اُس نے دھیمی آواز میں کہا، مگر اُس کے" دل کو اچھی طرح معلوم تھا — وہ کبھی بھی واقعی محفوظ نہ تھی۔

وہ اس سے دور ہوتے ہی مخالف سمت میں بھاگتی ہے۔ سامنے سے سارہ آرہی تھی۔ یہ کیا سانحہ تھا؟

خاموش ہو جاؤ۔ وہ سارہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اس بات سے بے خبر کہ رخسار یہ منظر ملاحضہ کر چکی تھی اور اپنے رنگوں میں رنگ چکی تھی۔

اگر وہاں تھا کوئی تو وہی جو اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کوئی ستارہ جو اس کی پہنچ سے بہت دور ہوں۔

بینش کمرے میں آتے ہی عبایا اتارتی ہے۔ اک آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے ہوئے رخسار پر بہہ نکلتاہے۔

کسی بھی مرد کی نظر اس کے بال تک کو نہ پڑ سکی تھی۔ خود کو اک شخص کی امانت کی طرح بچا رکھا تھا۔ وہ خود تو نہ رہا ۔

مگر آج میری آنکھیں کسی اور آنکھوں کی توجہ کا مرکز بن" " گئی۔

اس کے خود کو تھامنے پر پشیمان تھی یا نینوں کے ملنے پر؟

سارہ کمرے میں داخل ہوتے ہی بینش اس کے متعلق کوئی ذک

اس کے خود کو تھامنے پر پشیمان تھی یا نینوں کے ملنے پر؟
ساره کمرے میں داخل ہوتے ہی بینش اس کے متعلق کوئی زکر مت کرنا۔
کس کے متعلق؟ کسی ادھورے خواب کے متعلق؟
نیم مسکراہٹ کے ساتھ محبت کی قیمت ہوتی ہے۔
محبتوں کی قیمتیں نہیں ہوا کرتی نہ ہی یہ بازاروں میں بکتی ہیں بلکہ بہت خاموشی سے پروان چڑھتی ہیں جہاں من پسند روح ملے وہی بیٹھ جاتی ہیں۔
من پسند روحیں کیسے ملتی ہے۔ یہ عالم ارواح کی دلکشی ہے۔
لگتا ہے بہت اہم اور خوبصورت موضوع زیرِ گفتگو ہے۔ یقیناً آج کا موضوع ہوگا۔ اوہوں! میں تو بھول ہی گئی۔ ساره شاہ زین اور پیرنی بینش شاہ میر شاہ کو کمرہ عدالت میں یاد فرمایا جا رہا ہے۔
اپنا تعارف کس طرح کروانا پسند کروں گی تمہارے باپ کا کیا نام ہے۔
خیریت؟
کیسا سوال کر رہی ہے پیرنی صاحبہ میں نے ازخود آپ کو اک نا محرم کی باہوں میں لپٹے ہوے دیکھا ہے۔ اب تماشا تو بنتا ہے نہ ساره...
ضرور بنتا ہے اسی لیے تو خواجہ سراؤں کی ٹولی آپہنچی ہے اب تو تماشا کھل کر جمے گا۔
جبکہ رخسار جاتے ہوئے دروازہ زور سے مارنا نہیں بھولی۔
جل ککڑی کہی کی
چلو۔

کابل – رات کی خاموشی، کمرے میں مدھم روشنی، ایک خفیہ مقام

وہ کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، باہر برف گر رہی تھی لیکن اس کا ذہن کسی اور دنیا میں بھٹک رہا تھا۔ لاہور کی وہ لڑکی اس کی منگیتر... بینش... اس کی آواز، اس کی چپ، اس کا عکس — سب کچھ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔

کیا وہ اب بھی میرا انتظار کرتی ہوگی؟" اس نے خود سے" پوچھا، مگر جواب خاموشی میں دفن ہو گیا۔

اس کا دل کسی اور محاذ پر لڑ رہا تھا — اس بار دشمن کوئی غیر ملکی ایجنسی نہیں تھی، بلکہ وہ نظام جس نے اپنی ہی قوم کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ بغاوت کر چکا ہے۔ اب وہ کسی ادارے کا فرد نہیں رہا، بلکہ اپنے ضمیر کا قیدی بن چکا تھا۔

میں نے جس کے لیے جان دی، وہی ادارہ اب ظلم پر خاموش ہے۔"
"میں کیسے ان کے ساتھ رہوں؟
اس نے ہاتھ میں پکڑا فون دیکھا، جس میں اقوام متحدہ میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سابقہ وزیر اعظم کی ایک پرانی تقریر چل رہی تھی۔
ایاک نعبد و ایاک نستعین
"یہ شخص... کم از کم حق کی بات تو کرتا ہے۔"

اسے علم تھا کہ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ مگر دل میں ایک ہی خواہش تھی — بینش کو ایک بار دیکھنے کی۔

کیا ہوا ہے آج؟ کسی نے کچھ بتانا مناسب کیوں نہیں سمجھا میری بیٹی کی آنکھیں کسی کی توجہ کا مرکز بن گئی اور تم کہ رہی ہو سانحہ تھا۔ صالحہ بیگم کی گرجدار آواز لاونج میں

رہی ہو سانحہ تھا۔ صالحہ بیگم کی گرجدار آواز لاونج میں گونجی۔
وہ شخص بینش کا محافظ تھا۔
محافظ کا مطلب سمجھتے ہیں۔
اس نے بینش کو جان لیواہ حملے سے بچایا ہے ورنہ ہم سب ہم۔۔۔ پتا نہیں کس حالت میں ہوتے۔۔
اس انمول شخص نے ہماری انمول کو بچا لیا۔

- ---------

بینش کو کٹہرے میں لا کر کھڑا کرنے کا خواب کبھی مکمل نہ ہوگا۔ سازشی عورت تمہاری کوششیں نا پائیدار ہے۔
بہت جلد تم یہ منظر دیکھو گی۔ تمھاری چاہ ہی تمھیں ڈھبوئے گی۔

کیا ہوا امّا جان ۔ سر میں ہلکا سا درد ہے۔
"سر درد تو محض ایک بہانہ ہے۔ درحقیقت کچھ باتیں ہمارے دماغ کو اس قدر چھبتی ہے کہ ہم برداشت نہیں کر پاتے۔ "
کہاں سے سیکھتا ہے۔ اتنی بڑی باتیں میرا بچہ۔۔
ساره کو کیا ہوا ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔ اس کے منہ کے اتار چڑھاؤ سے اس کے موڈ کے سخت ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔
کیا دیکھ رہی ہو موبائل فون پر۔
"غزہ جلس رہا ہے کوئی کچھ کرتا کیوں نہیں".
" یہاں ضمیر مکمل ہی جلس چکے ہیں۔"

صبح بخیر! چچی جان

چلو کمرے میں۔ کیوں خیریت۔ اتنے سوال کیوں پوچھتی ہوں۔ .تم مشکوک حرکتیں کیوں کرتی ہوں۔ اللہ !بینش

اب بولو۔ تم جانتی ہوں۔ بتاؤ گی تو جانو گی۔ سارہ کی تیوری چڑھتی ہے۔ وہ سچ میں سپر مین تھا۔ کیسے تمھیں بچایا۔ اور تو اور ان کو موت کے گھاٹ بھی اتار دیا۔ قسم سے ہیرو کی طرح اینٹری ماری اور تمھیں بچا لیا۔

کا Love at the first sight - سین تو نہیں ہوا۔

!شٹ آپ

وہ تمھیں بلکل پسند نہیں آیا۔ اتنا قریب سے دیکھنے کے باوجود بھی۔ جواب میں بینش بس شانے اچکا تی ہے۔

محبت بنا دیکھے بھی ہوتی ہے۔بینش یک دم سارہ کی طرف دیکھتی ہے۔ جو نظریں جھکائیں پینسل خالی صفحے پر پھیڑ رہی تھی۔

!حضرت علی کا قول ہے

جو محبت بنا دیکھے اور بنا ملے ہو۔ وہ محبت خدا"

" کی نعمت ہوتی ہے۔

تو پھر ملتی کیوں نہیں۔ یہ ملتی نہیں میسر ہوتی ہے۔ تو پھر اس کو تھامتے وقت اتنا ڈر کیوں لگتا ہے۔ کیونکہ نعمت کے بارے میں سوال کیا جا تا ہے۔

یہ کوئی آرٹیکل نہیں ہے سارہ..... کس سے محبت ہوئ ہے۔ سارہ الجھ جاتی ہے۔ کیا مطلب؟ مطلب یا وضاحت نہیں سوال پوچھا ہے؟

ماموں کے بیٹے سے... دو ماہ پہلے ندا آپی کی شادی پہ گئی تھی۔ تو ان کے بارے میں سنا تھا۔ وہ بھی ہماری ہی یونیورسٹی

تھی۔ تو ان کے بارے میں سنا تھا۔ وہ بھی ہماری ہی یونیورسٹی میں ہے.... فرخ نام ہے ان کا ۔
اوں! تو اسی لیے کل کلاس میں اتنی بے قراری تھی ۔

یونیورسٹی کی پہلی کلاس تو دس ہے آٹھ بجے آنے کا مقصد۔ کسی سے ملن کرنا ہے۔ ورنہ میں کیوں صبح صبح ان برآمدوں کا منہ تکنے لگی۔ ..
جب فرخ کا نام آئے گا۔ تب وہ پریزنٹ بولے گا۔ دھیان کرنا۔ اتنے میں براؤن پینٹ اور نیلی شرٹ میں ملبوس ایک لڑکا کلاس میں داخل ہوا تو پروفیسر اسے کہتے ہیں ۔ فرخ آج تم بہت لیٹ آئے ہوں۔

فضا بارود کی بو سے بوجھل تھی۔ کابل کی سنسان گلیوں میں ہر قدم پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ صارم کی سانسیں تیز تھیں، پسینے میں بھیگے چہرے پر دھیما سا عزم چمک رہا تھا۔ وہ جانتا تھا، اگر آج کی رات وہ نکلنے میں کامیاب نہ ہوا... تو شاید کبھی نہ نکل سکے۔

ایک پرانی عمارت کی چھت پر پہنچ کر اس نے دور شہر کی سرحدوں کو دیکھا—جہاں سے آزادی کی ایک نئی صبح جھانکتی تھی۔ لیکن پیچھے گلی سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ جھک کر دیوار کے پیچھے چھپ گیا۔

وہ ادھر ہی ہے، گھیر لو!" کسی اجنبی آواز نے چیخ کر حکم دیا۔" بندوقوں کی زبانیں جلنے لگی صارم نے گولیوں کی بارش میں ایک چھلانگ لگا کر نیچے کی تاریک گلی میں پناہ لی۔ اس کے ہاتھ میں بس ایک تصویر تھی — جسے اس نے کبھی چھوا تک نہیں تھا، لیکن جس کے لیے وہ اپنی جان دائو پر لگا بیٹھا تھا

ایک چھلانگ لگا کر نیچے کی تاریک گلی میں پناہ لی۔ اس کے ہاتھ میں بس ایک تصویر تھی — جسے اس نے کبھی چھوا تک نہیں تھا، لیکن جس کے لیے وہ اپنی جان داؤ پر لگا بیٹھا تھا۔

دھڑکنیں تیز ہو گئیں جب اچانک ایک پرانا دروازہ اس کے پیچھے بند ہوا۔

"اتنی آسانی سے نہیں جا سکو گے، تم..." ایک گھمبیر آواز نے اسے روک لیا۔

وہ مڑا... اور سامنے جو چہرہ تھا، اس نے زمین کھینچ لی اس کے قدموں سے۔ وہ شخص کوئی اجنبی نہ تھا... وہ تو وہی تھا جسے صارم سکندرنے اپنا محسن جانا، اپنا سایہ سمجھا... مگر وہی اب سب سے بڑا راز بن چکا تھا۔

اور اندھیرے میں گونجتی ایک آخری گولی...

(باب ختم، اگلا باب: "پردے کے پیچھے")

-